عباسی بغداد کا فنونِ لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج، اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نقوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کیلئے مامور ہی نہیں کئے گئے تھے۔ قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کارِ نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔

مابعد جمہوریت اور اسلام

ہم بہت تیزی کے ساتھ ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جسے غالباً مابعد جمہوریت کا نام دینا مناسب ہو۔ کل تک جن انسانی اقدار کو ہمارے معاشرے میں قبولیت عامہ حاصل تھی آج وہ مسلسل زوال پذیر ہیں۔ اکرام انسانیت، حریت فکر و عمل اور ایک دوسرے کا باہمی احترام جس سے کسی مہذب معاشرہ کی شناخت قائم ہوتی ہے آج زبردست خطرے میں ہے۔ غور و فکر اور اظہار خیال کی آزادی، ایسا محسوس ہوتا ہے اب سلب ہو جائے گی اور یہ سب کچھ مشرق سے کہیں زیادہ مغرب میں ہو رہا ہے جسے جدید جمہوریت کے گہوارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

گیارہ ستمبر کے وقوعہ نے تہذیبوں کے مابین تصادم کو ہوا نہیں دی ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد حریت فکری اور بند دماغی انسانیت اور فاشسزم کے مابین جاری معرکہ آرائی اب فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے۔ جو لوگ مغرب کی معاصر تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں اور جو گزشتہ ربع صدی میں پیش آنے والی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے واقف ہیں وہ یقیناً اس احساس سے خالی نہیں ہوں گے کہ گیارہ ستمبر سے بہت پہلے بلکہ سویت یونین کے زوال کے بعد ہی، مغربی دنیا آہستہ آہستہ Liberal Pluralism سے Evangelical Democracy کی طرف سفر کر رہی تھی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ مغرب میں جمہوریت کے نام پر چند دولتمند ہاتھوں میں اقتدار کا جو ارتکاز ہوا تھا وہ رفتہ رفتہ ایک ایسے نظام کی داغ بیل رہا تھا جس کی صحیح تعریف کے لئے سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک الفاظ وضع نہیں ہوئے ہیں اور اسی لئے ہم اسے مابعد جمہوریت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔ گو کہ امریکی معاشرے میں جمہوری اقدار کی فروخت کی بات اب بھی جاری ہے اور آج بھی امریکی خارجہ پالیسی کا بنیادی ہدف دنیا کے مختلف حصوں میں جمہوری نظام کی توسیع اور اس کا استحکام بتایا جاتا ہے۔ لیکن ان بلند بانگ دعووں کے علی الرغم اب اس حقیقت سے پردہ اٹھ چکا ہے کہ امریکی پالیسی ساز جمہوریت کا فروغ تو کجا خود دنیا کی دوسری جمہوریتوں کو انگیز کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ایک طرف جمہوری اقدار ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آزاد ریاستوں کی خود مختاری کا احترام کریں اور ان معاشروں میں رہنے والے لوگوں کو ان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی جینے کا حق دیں تو دوسری طرف

Evangelical Democracy کے علمبردار یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا پر امریکی طرز زندگی کی حکمرانی قائم ہوجائے۔ گویا آج فروغ جمہوریت کے نام پر امریکہ کی قیادت میں جو جنگ لڑی جارہی ہے وہ ایک عالمی نظام استبداد کے قیام کی جنگ ہے۔ یہ گویا اس بات کی بہیمانہ کوشش ہے کہ پوری دنیا اب صرف کوکوکولا اور میگ برگڑ کے تہذیبی شکنجوں میں کس دی جائے۔

جمہوریت ہے کیا شئے؟ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اقوام وملل کے لئے اس سوال کے جواب مختلف ہوسکتے ہیں۔ جمہوریت کی کوئی ایک ایسی تعریف جس کے صحیح ہونے پر اصرار کیا جائے دراصل جمہوریت کی بنیادی روح کے منافی ہوگی۔ انسانوں کے کسی ایک طبقہ کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے زندگی جینے کا کوئی حتمی طریقہ متعین کردے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اسے جمہوریت نہیں بلکہ فاشسزم کہا جائے گا۔ اگر امریکہ کا جمہوری معاشرہ اس بات کی ضرورت سمجھتا ہے کہ مجرموں کو سزائے موت جیسی انتہا پسند سزائیں دی جائیں تو اس کے لئے اس بات کا کیا اخلاقی جواز ہے کہ وہ فرانسیسی حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت کرے جس کے مطابق ریاستی اسکولوں میں اسکارف یا دوسری مذہبی علامتوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی اس کے پاس اس بات کے لئے کوئی اخلاقی جواز ہے کہ وہ مسلم حکومتوں سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ یہ حکومتیں اپنی تہذیبی اور مذہبی اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم جنس پرستوں کو قانونی اقلیت تسلیم کرلیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کی تنگ نظر اور جامد تعبیر نے جس کا اظہار بار بار مغربی دارالحکومتوں سے ہوتا رہا ہے روحِ جمہوریت کو بری طرح زخمی کردیا ہے۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ جمہوریت سیاسی اور سماجی تبدیلی کا ایک پرامن طریقہ ہے جسے انسانوں نے صدیوں کے تہذیبی سفر میں دریافت کیا ہے لیکن اب مغربی جمہوریت کے سلسلے میں یہ خام خیالی ختم ہورہی ہے۔ اب جمہوریت نام ہے دو برائیوں میں سے کمتر برائی کے انتخاب کا۔ اور صرف مغرب میں نہیں بلکہ جہاں جہاں جمہوری معاشرہ مستحکم ہوا ہے وہاں کچھ ایسی ہی صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔ اہل نگاہ واقف ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ کے حالیہ انتخابات میں عوام کے لئے گندے انڈوں اور سڑے ٹماٹروں میں سے ہی کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بش اور کیری، ٹوری اور لیبر کوئی بھی عوام کی پسندیدہ ترجیحات میں شامل نہیں تھے۔ مہذب جمہوری معاشروں میں جب عوام کی امنگوں اور ان کی آرزوؤں کے مطابق متبادل مفقود ہوجائے اور انہیں اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ ناپسندیدہ عناصر میں سے ہی کسی ایک کو منتخب کریں تو یہ انتخابات انسانی معاشرے کو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لے جائیں گے اور یہ صورت حال اس دنیا کو رفتہ رفتہ صالح اور امن پسند انسانوں کے لئے ایک قید خانہ میں تبدیل کردے گا۔ صاف محسوس ہورہا ہے کہ آج سویت یونین کی عقوبت گاہیں اور نازی جرمنی کے تعذیبی مراکز گونت ناموبے جیسے بے شمار Detention Facility کی شکل میں پرانی بہیمیت کو نئے نام سے زندہ کررہی ہیں۔

اس خطرے کے پیش نظر فطری طور پر ہمارے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیا ماضی کی طرح ایک بار پھر روحِ جمہوریت کو

اپنے دشمنوں پر سرخروئی حاصل ہو سکے گی؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا کچھ آسان نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مابعد جمہوریت جس صورتِ حال سے عبارت ہے وہاں اس بارے میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے کہ معاشرے میں قوت کے واقعی مآخذ کہاں پائے جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کا یہ پورا متحرک نظام کہاں سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ بظاہر دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوسکتا ہے کہ امریکی استعمار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے فوجی اڈوں اور تعذیبی مراکز کے ذریعے اس دنیا کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس استبدادی نظام کے اندر کچھ ایسے نامحسوس اور پراسرار ہاتھ بھی ہیں جن پر اب کسی ریاست کا واقعی کنٹرول نہیں رہ گیا ہے۔ ملٹی نیشنل تجارتی کمپنیاں، بین الاقوامی نوعیت کی رفاہی تنظیمیں، بے پناہ وسائل رکھنے والے ٹرسٹ اور تہذیبی ادارے، غیر معمولی سرمایہ کی حامل مالیاتی تنظیمیں اور میڈیا چینل جو چند افراد کی ملکیت ہیں استبدادی نظام کے اندر غیر محسوس طور پر اپنا رول انجام دیتی ہیں۔ سرمایہ داروں کے اس چنگل میں موجودہ دنیا کچھ اس طرح پھنس کر رہ گئی ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک نئی تبدیلی کے لئے آغاز کہاں سے کیا جائے۔ اس صورتحال نے نہ صرف یہ کہ مغربی جمہوریت کو ایک اندھی گلی میں پہونچا دیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ فرد جو مدتوں سے جمہوریت کا خوگر تھا اب اپنے آپ کو ایک نظری اور فکری خلا سے دوچار پاتا ہے۔

مابعد جمہوریت کے عہد نے ہمیں ایک ایسی مایوسی سے دوچار کر دیا ہے جس کی نظیر ان لوگوں کے بیانات میں بھی نہیں ملتی جو کبھی تاریخ کے خاتمے کی پیش گوئی کیا کرتے تھے، کہ کل تک جو لوگ جمہوریت کی فتح کے بعد تاریخ کے خاتمے کا بگل بجا رہے تھے ان کے ذہنوں میں یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود تھی کہ تاریخ اپنے سفر کے خاتمے کے بعد دوبارہ اسی دائرے میں متحرک ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس موجودہ صورت حال ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ جمہوریت کے خاتمے اور اس کی ناکامی کے بعد اب انسانوں کے پاس کوئی نظریہ بچا ہی نہیں ہے۔ یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ تاریخ بے سمتی کا شکار ہوگئی ہے اور ہم مستقبل سے بے خبر ایک نامعلوم منزل کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ مستقبل کے سلسلے میں اس بے یقینی نے ہم میں سے بہتوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ اے کاش! اس چلتی پھرتی بے سمت گردش کرتی ہوئی دنیا سے ہم خود کو علیحدہ کر سکتے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس دنیا سے اتر کر جائیں تو کہاں جائیں کہ کوئی دوسری متبادل دنیا موجود بھی تو نہیں۔ ان سرمایہ دارانہ کمپنیوں نے ذرائع ابلاغ کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے مثال کے طور پر جنرل الیکٹرک کمپنی کو لیجئے جس کی ملکیت NBC, CNBC, MSNBC جیسی میڈیا کمپنی ہیں۔ اسی طرح CNN ٹائم وارنر کی ملکیت، ABC ڈزنی کی ملکیت اور CBS وائیکوم کی ملکیت ہے۔ سرمایہ داروں کے میڈیا چینل ہمیں وہی کچھ دکھاتے ہیں جو ان کی اپنی آرزوؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ اگر عام انسانوں کو اصل صورت حال کا ادراک ہوگیا تو دنیا پر ان کی موجودہ اجارہ داری باقی نہیں رہ سکے گی۔

یہ ہے وہ مایوس کن صورتِ حال جس سے ہم دو چار ہیں۔ بظاہر تو اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا کہ اس مستحکم استبدادی نظام کے خاتمہ کے لئے کوئی موثر تحریک مستقبل قریب میں اٹھ سکے گی۔ رہی مغرب میں چلنے والی امن کی تحریکیں یا انسانی حقوق کی انجمنیں جو اس صورت حال پر وقتاً فوقتاً واویلا مچاتی رہتی ہیں تو ان سے کسی بنیادی تبدیلی کی امید اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ یہ تمام تحریکیں دراصل اسی سرمایہ دارانہ نظام کا توسیعہ ہیں جو اپنی مالی امداد کے لئے انہی سرمایہ دارانہ مالیاتی اداروں اور اوقاف پر انحصار کرتی ہیں۔ استبدادی نظام انہیں اسی وقت تک انگیز کرے گا جب تک کہ ان انجمنوں کی چلت پھرت سے نظام سرمایہ داری کو واقعی کوئی خطرہ نہ ہو۔ جو لوگ آج مغرب کی سڑکوں پر جنگ اور ماحولیات کی تباہی کے خلاف نعرے بلند کر رہے ہیں ہم ان کے اقدامات کو مستحسن تو ضرور سمجھتے ہیں البتہ ان سے کسی بنیادی یا انقلابی تبدیلی کی امید نہیں لگاتے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مغرب میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ جب یہ انجمنیں نظام سرمایہ داری کے لئے خطرہ بننے لگی ہیں استبدادی نظام نے فوری طور پر ایسے اقدامات کئے ہیں جس نے ان انجمنوں کی چیخ و پکار کو فی الفور بے اثر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر اکتوبر 2000 میں کوئی پچاس امریکی غیر سرکاری انجمنوں، جن میں مشہور زمانہ تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ بھی شامل تھیں، نے اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ امریکی ریاست کو اس بات کا پابند کرے کہ شہریوں کے مابین ترجیحات اور ناانصافی کے خاتمے کو یقینی بنائے۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ سے چند دن قبل ڈربن میں اقوام متحدہ نے نسل پرستی کے خلاف ایک اجلاس منعقد کیا تھا جس میں بہت سی غیر سرکاری تنظیموں نے ایک قرارداد کی حمایت میں آزاد منڈی کی معیشت کو بنیادی طور پر ایک ناقص نظام بتایا تھا گویا امریکی سرمایہ دارانہ نظام خود اپنے اندرون میں پلنے والی رفاہی انجمنوں کی زد پر تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا۔ گیارہ ستمبر کی آڑ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا جو بگل بجایا گیا اس میں یہ ساری باتیں دب گئیں۔ دہشت گردی کے حوالے سے اظہار خیال پر اتنی پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ اس قسم کی تنقید اور ان مسائل پر کسی مباحثے کا سرے سے امکان ہی ختم ہو گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ جمہوریت کی موت کے بعد اب ہمارے لئے اس کے علاوہ اور کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ ہم دوسرے متبادل نظام کی تلاش تیز تر کر دیں۔ فی الفور کوئی ایسا متبادل موجود نہیں ہے جو اس جاری نظام کی جگہ لے سکے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خدا کی کتاب آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے لیکن ہم صدیوں سے اسے جزدان میں لپیٹ کر رکھنے اور اس سے برکت حاصل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عام مسلمانوں کے علاوہ اس سرزمین پر دوسرے مذہبی گروہ بھی موجود ہیں، وہ لوگ بھی ہیں جنہیں حضرت مسیح نے 'زمین کا نمک' اور 'پہاڑی کا چراغ' قرار دیا تھا اور وہ لوگ بھی جو آل یعقوب پر ہونے والے انعام واکرام کے حوالے سے آج بھی خود کو خدا کا لاڈلا سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ اب ان پہاڑی کے چراغوں میں کوئی روشنی رہی اور نہ ہی خدا کی لاڈلی قوم سمجھنے والوں کے پاس دنیائے انسانیت کے لئے کوئی منصوبہ ہے۔ عرصہ ہوا اہل یہود کی مذہبی فکر صرف

اپنی فلاح و بقا کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی نجات کی فکر میں لگے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیت اپنی تاریخ میں اتنے نظری حوادث سے دوچار ہوئی ہے کہ اس کی تاریخ نظری مصالحت کی داستان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے انبیاء کے باقیات ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ایک پرامن مستقبل کی امید میں اپنے اپنے دائروں میں متحرک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام گروہوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ہم آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ عالمی نوعیت کا ہے۔ استبدادی نظام کا شکنجہ بڑا سخت اور مضبوط ہے اس سے نجات کے لئے جب تک مشترکہ جدوجہد کا ڈول نہیں ڈالا جاتا کامیابی ممکن نہیں۔

جو لوگ صدیوں سے اس طرز فکر کے اسیر رہے ہوں کہ ایک نئی دنیا کی تعمیر میں وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ساتھ نہیں لے سکتے، ان کے لئے کسی مشترکہ جدوجہد کا ڈول ڈالنا کچھ آسان نہ ہوگا اور نہ ہی دوسری قوموں کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ کسی داعی گروہ کو جس کا مذہب مختلف ہو خیر کے کام میں کھلے دل سے اپنا تعاون دیں۔ گویا ایک مشترکہ جدوجہد کے لئے نظری بنیادوں کی تلاش کا کام اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد رسول اللہ کے سچے وارثین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان نظری بنیادوں کو از سر نو اجاگر کریں جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ ہم خیر کے کام میں دوسری حلیف قوموں کا تعاون کس طرح حاصل کریں۔ قرآن کی نظر میں یہ بات کلمۃ سواء ہو سکتی ہے ایک مشترکہ ایجنڈا جو تمام انسانوں کی فلاح کا ضامن ہو۔ قرآن کی یہ نظری اساس غیر اقوام کے لئے دوبارہ باعث کشش ہو سکتی ہے جب انہیں یقین ہو جائے کہ محمد رسول اللہ کے متبعین ساری دنیا کو استبدادی نظام سے نجات دلانے کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر قوم مسلم کی حکمرانی کا خواب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ماضی میں ایسا ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے نظری انقلابات کو قومی سلطنتوں کے استحکام میں استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لہذا آج اگر متبعین محمدؐ کو ایک عالمی تحریک نجات کی قیادت سنبھالنی ہے تو انہیں عام انسانوں پر یہ بات واضح کرنی ہوگی کہ وہ سرمایہ دارانہ استبداد کے خاتمے کے بعد ایک ایسے قرآنی معاشرہ کی تشکیل کا منصوبہ رکھتے ہیں جہاں تمام ہی انسانوں کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع میسر آئیں گے۔ کسی سے ناانصافی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی کسی کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ لسانی، نسلی، تہذیبی اور جغرافیائی نسبت کی وجہ سے نئی تہذیب کے حاشیے پر رہ گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک ایسے آفاقی پروگرام میں متبعین محمدؐ کو دوسرے مذاہب کی سعید روحوں کا تعاون نہ مل سکے۔

ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ ماضی سے کہیں مختلف ہے۔ ٹیکنالوجی نے دنیا کو اتنا مختصر کر دیا ہے کہ اب یہاں کسی ایک گروہ کا دوسروں سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔ نئی دنیا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ایک آفاقی نظریہ کی طالب ہے۔ لہذا جو لوگ جدید دنیا کی قیادت کی بات سوچتے ہوں انہیں پہلے اس بات کا التزام کرنا ہوگا آیا ان کا نظری ڈھانچہ ایک پیمبرانہ لب ولہجہ کا حامل ہے یا نہیں۔ ایک ایسا لب ولہجہ جو پوری دنیائے انسانیت سے خطاب کرتا ہو۔

آیئے ذرا اس نکتے کا تفصیلی بیان کیا جائے۔ عام ذہنوں میں اسلام کا جو تصور راسخ ہے وہ بالعموم دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ اولاً وہ پیغام جو خدا نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ پر بذریعۂ وحی اتارا، ثانیاً وہ سماجی اور سیاسی تاریخ جو اسلام کے پیروکاروں نے گزشتہ صدیوں میں وضع کیا۔ گویا اسلام کے نام پر ہمارے ذہنوں میں صرف محمد رسول اللہ کی طرف بھیجا جانے والا پیغام ہی نہیں آتا بلکہ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ آج اس مروجہ اور متوارث اسلام میں جسے ہم مسلم تاریخ اور مسلم تہذیب کے نام سے جانتے ہیں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق عربوں، ترکوں، مغلوں اور دوسری اقوام کی اپنی مخصوص تہذیب سے ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ صدیوں کے تعاون میں یہ چیزیں مسلم شناخت کا جز بن گئی ہیں۔ اسلام کی آفاقیت میں ان ثقافتی عوامل کے شامل ہو جانے سے ہوا یہ ہے کہ آج دوسری اقوام اس ثقافت میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے گویا مسلمانوں کی تہذیبی ثقافت بھی اس آفاقی دین کا ایک جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی اقوام اسلام کو بالعموم ایک عرب مذہب کے طور پر دیکھتی ہیں۔ وہ محمد رسول اللہ کو صرف عالم عرب کا پیغمبر سمجھتی ہیں۔ اسلام کے نام سے ان کے ذہنوں میں ایک ایسے مذہب کا تصور ابھرتا ہے جو مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے لئے مخصوص ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا آفاقی پیغام کسی ایسے خیال کی توثیق نہیں کرتا۔ البتہ ماضی میں ہمارے فقہاء نے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کے خانوں میں جس طرح سمجھنے کی کوشش کی اس سے یہی تاثر پیدا ہوتا تھا کہ اسلام کو عربیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج جہاں کہیں بھی احیائے اسلام کی بات ہوتی ہے عام ذہن یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ایک بار پھر اپنے غلبہ کا پلان بنا رہے ہیں۔ اسلام کے سلسلے میں اس قسم کی غلط فہمیوں کو رفع کئے بغیر ہم غیر مسلم اقوام کو عالمی انقلاب کے پروگرام میں شامل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس غلط فہمی کو ختم کرنا ہوگا کہ مستقبل میں غلبہ اسلام کی تحریک قومی مسلمانوں کے سیاسی یا ثقافتی غلبے پر منتج ہوگی۔ ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اسلام ایک ایسی دنیا کے قیام کا علمبردار ہے جہاں تمام ہی انسان رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر مشترکہ طور پر خدائے واحد کی توحید کا نغمہ گا سکیں جہاں نہ کوئی قوم غالب ہو اور نہ مغلوب۔ یہی اسلام کی دعوت کا لب لباب ہے اور یہی ہے وہ توحید خالص جس کا اسلام داعی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سکڑتی دنیا نے ایک ایسے آفاقی اسلام کے ظہور کی راہ ہموار کر دی ہے۔

قرآن رہتی دنیا کے لئے کتاب ہدایت ہے اس کی معنویت جتنی کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔ یہ جس طرح عربوں کو خطاب کرتا ہے اسی طرح غیر عرب اقوام بھی اس کے مخاطب ہیں۔ کسی قوم کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن چونکہ اس کی زبان یا اس کی سرزمین میں نازل ہوا ہے اس لئے خدائی اسکیم میں اسے وہبی طور پر کوئی امتیازی مقام حاصل ہے۔ اور نہ ہی غیر عرب اقوام کو اس غلط فہمی کا شکار ہونا چاہئے کہ مستقبل کے خدائی منصوبے میں ان کا مقدر اس مشن کے حاشیے پر رہنا ہے۔ مسلم اہل فکر پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ عباسی عہد میں مسلم شناخت اور مسلم عقائد پر جو بحثیں چلی ہیں اس کے زیر اثر ہمارے فقہاء مسلمان بنے رہنے

کے لئے ان ظواہر کو بھی مسلم شناخت کا حصہ قرار دے بیٹھے تھے جن کا تعلق اسلام کے آفاقی پیغام سے کہیں زیادہ عرب ثقافت سے تھا۔ پھر آنے والے دنوں میں چونکہ رفع فتنے کی خاطر بحث کا دروازہ بند کر دیا گیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ باب اجتہاد بند ہے۔ اس لئے راسخ العقیدہ علماء نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ ابتدائی عہد کی طرح عقائد کی بحثیں دوبارہ سر نہ اٹھائیں خواہ ایسا کرنے کے لئے انہیں قرآن مجید سے راست اکتساب کا دروازہ کیوں نہ بند کرنا پڑے۔ جب تک مسلم ریاست بغداد، اسپین، ترکی اور ہندوستان میں جس شکل میں بھی باقی رہی علماء نے کیتھولک چرچ کی طرح اس بات کا پورا التزام کیا کہ خدا کی کتاب کے وہی مطالب و معانی سمجھے اور سمجھائے جائیں جو انہوں نے سمجھا ہے۔ خدا کی کتاب پر انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو تشریح و تعبیر کا کامل اختیار مل جانے سے عملاً یہ ہوا کہ عام انسانوں کا وحی ربانی سے براہ راست تعلق باقی نہ رہا۔ رفعِ فتنہ کی خاطر علماء کا یہ قدم خود ایک بڑا فتنہ بن کر رہ گیا۔ قرآن کی آفاقیت انسانی تعبیرات کی تنگ نظری میں مقید ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ صورت حال تھی جس نے آخری نبی کے متبعین کو مسلم قومی حصار میں قید کر ڈالا جس کے نتیجے میں انہیں اقوام عالم کی سیادت سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ دنیائے انسانیت کی موجودہ بے کسی اور بے سمتی ہم سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس آفاقی پیغام کو مسلم قومی ورثہ سے نکال کر دنیائے انسانیت کے مشترکہ چارٹر کے طور پر پیش کریں۔ ہمارے خیال میں ماضی کے مقابلے میں کلمۃ سواء کی بنیاد پر انسانوں کی عمومی نجات کا امکان آج کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سکڑتی دنیا میں اقوام عالم کے مابین گہرے رابطوں کی بحالی ہے جس میں انٹرنیٹ ایک اہم رول انجام دے رہا ہے اور دوسری وجہ خود مسلم معاشروں میں پائی جانے والی وہ عمومی فکرمندی اور بیداری ہے جس نے اہل فکر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ احیاء اسلام کی پرشور تحریکوں اور بے شمار قربانیوں کے باوجود ہماری دوبارہ تنصیب امامت کا کام ابھی باقی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جس تہذیبی اسلام کی پرزور دعوت دیتے رہے ہیں اس کی جڑیں ہماری تہذیبی تاریخ میں ہیں قرآن مجید میں نہیں۔ اور یہ کہ کسی ثقافتی اسلام میں دوسری اقوام کے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے خواہاں ہیں انہیں سب سے پہلے تو اپنا نظری محاکمہ کرنا ہوگا آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری اسلامی سرگرمیوں میں اب پیمبرانہ وسعت اور آفاقیت کا فقدان ہے جو تمام اقوام کے دکھے دلوں پر مرہم رکھتی اور ان کی نجات کا مژدہ سناتی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم پیمبرانہ اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق کو محسوس کریں۔ اگر مسلمان فی زمانہ پیمبرانہ لب و لہجہ کی تشکیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ معاصر تاریخ کا اتنا بڑا وقوعہ ہوگا جس سے ایک دنیا جنم لے سکتی ہے۔